خلیفہ عبدالحکیم

اسلام کا سیاسی و معاشی تصوّر

یہ بات بخوبی معلوم و مشہور ہے کہ اسلام محض کوئی مابعد الطبیعی عقیدہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ زندگی کا ایسا مکمل نظام اور جامع تصور ہے، جو ایک منطقی ربط کا حامل ہے۔ ہم اس کے نظریات کا ایک مختصر خاکہ پیش کرنے کی کوشش کرینگے۔ ہم دیکھیں گے کہ وہ ہر بڑے منصوبہ کے بعض اجزا سے اتفاق کرتا ہے اور بعض دیگر حصّوں کو رد کر دیتا ہے۔ ہر منصوبہ کا اس طرح مختصر بیان یہ ظاہر کر دیگا کہ کوئی ایسی اہم خرابی یا تو اس کی بنیاد ہی میں موجود ہے۔ یا وہ عواقب جو ناگزیر طور پر اس سے رونما ہوتے ہیں اسے فاسد کر رہے ہیں۔

اصول عدم مداخلت پر مبنی سرمایہ داروں نے مجرد حریّت اور مساوات کی تبلیغ کی۔ مگر مملکت تنازع للبقاء میں غیر جانبدار رہ کر اس کا تدارک نہ کر سکی کہ ظالمانہ عدم مساوات سر نہ اٹھانے پائے۔ معاشرہ کو جاگیری اور شخصی حکومتوں کی ظلم و زیادتی سے آزادی دلا کر اس نے ایک قسم کی زر خرید غلامی کی ترویج کی۔ آزادانہ معاہدہ اور آزاد رائے کا حق بے سود ثابت ہوا۔ سیاسی عمومیت معاشی غلامی کے ساتھ متحد ہو گئی۔ انگلستان اور امریکہ جیسے ممالک میں سرمایہ دار اجارہ جماعت نے ان خرابیوں کو رفتہ رفتہ دور کرنے کی ایسی کوششیں کیں۔ جو بے قید سرمایہ داری سے صورت پذیر ہوتی ہیں۔ لیکن جو مشکلات اور دشواریاں اس نظام کے مزاج سے رونما ہوتی ہیں وہ معاشری انتشار و تشتّت پیدا کرتی ہیں۔

اسلام حریّت، اخوّت اور مساوات پر مبنی ہے۔ اور اس کا فلسفیانہ نقطۂ نگاہ خدا پرستانہ ہے۔ زندگی کے تمام فلسفے اور وجود سے متعلق اساسی اندازے زبردست عملی نتائج رکھتے ہیں۔ راسخ الاعتقاد اشتمالیت کا فلسفہ مادہ پرستانہ اور ملحدانہ ہے۔ اس کے برعکس اسلام یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ زندگی ایک روحانی ماخذ، ایک روحانی پسِ منظر، ایک روحانی مطمحِ نظر اور مقصد رکھتی ہے۔ کائنات پر بے بصر میکانی قوتوں کی کارفرمائی نہیں ہے۔ اور نہ وہ محض مادہ پرستانہ جدلیات کی تابع ہے۔ زندگی ایک مادی اساس بھی رکھتی ہے، اور اس کی اس حیثیت کو اسلام نظر انداز نہیں کرتا۔ یہ اس حقیقت سے باخبر ہے کہ انسان کو روحانی طور پر آزاد رکھنے کی خاطر اسے مادی خوشحالی کا یقین دلایا جائے۔

ایک مہربان، ہمہ داں، اور ہمہ تواں ہستی کی تخلیق کردہ کائنات اخلاق سے بے تعلق نہیں ہے۔ بلکہ وہ قطعاً خیر و خوبی ہے۔ جس کے طریقہ ہائے عمل چند دائمی اقدار کو وجود بخشتے ہیں۔

روح اور جسم کے درمیان یا دنیا اور آخرت میں کوئی تناقض نہیں۔ چونکہ خدا ایک ہے اس لئے جملہ موجودات باہم مربوط ہیں۔ مسلمانوں کو دوسری دنیا کی خوشحالی سے قبل اس دنیا کی خوشحالی کے لئے دعا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اخلاقی علت و معلول بھی

اس دنیا میں جس طرح اپنے اثرات مترتب کرتے ہیں ایسے ہی وہ اپنے اس عمل کو آخرت میں جاری رکھیں گے اشتمالیت تخلیق کے منجانب اللہ ہونے کی تردید کرتی ہے۔ اور اس کی تمام تاریخ انسانیت کی تشریح تمام مادی مظاہر کی طرح سراسر مادہ پرستی پر مبنی ہے۔ صرف پیدائش دولت کے طریقے اخلاقی، مذہبی اور تہذیبی اقدار پیدا کرتے ہیں۔ تاریخ کی قرآنی تشریح بالکل اس کے برعکس ہے۔ وہ دعوے کے ساتھ کہتا ہے کہ قوموں کا عروج وزوال قوم کے اعتقادات اور سیرتوں میں تبدیلیوں کے سبب سے ہوتا ہے۔ اور اسلام یہ یقین رکھتا ہے کہ بصیرت سے محرومی کے باعث قومیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ قرآن کی رُو سے حقیقی انقلاب کسی قوم کی زندگی میں واقع نہیں ہوتا جب تک کہ اس کے اخلاقی اور ذہنی نقطۂ نگاہ میں بھی تبدیلی نہیں ہوتی۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ۔ (انفال۔۵۳)

خدا کسی قوم کی زندگی میں اس وقت تک تبدیلی پیدا نہیں کرتا جب تک کہ ان کے نفوس کے انداز بدل نہیں جاتے۔

قرآن مادی طور پر خوشحال قوموں کی مثالیں پیش کرتا ہے۔ جو مادہ پرستانہ تنگ نظری کے سبب تباہ ہو گئیں۔ قانونِ اخلاق کے ابدی حقائق پر ایمان دلانے سے وہ خود غرض اور ظالم بن گئیں۔ انھیں اصلاح کے لئے بڑی بڑی مہلتیں دی گئیں۔ لیکن جب اُنہوں نے خدا کی نشانیوں کی پرواہ نہ کی۔ تو سزا کا دن ان پر آپہنچا اور وہ تباہ ہو گئیں۔ "خدا نے خیر و شر کی میزان قائم کی ہے۔ یہ میزان ایسی حساس ہے کہ ہر ذرہ اس میں وزن کیا جاتا ہے۔ اور جس کا نتیجہ اپنے وقت پر ظاہر ہوتا ہے۔" تاریخ کا اسلامی نظریہ اس کے خدا پرستانہ نقطۂ نگاہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اور تاریخ کا اشتمالی نظریہ اس کی مادیت سے رونما ہوتا ہے۔ یہ دو نظریات کلی طور پر باہم ایسے متخالف ہیں کہ ایک خدا پرست مسلمان کے لئے مارکسی، اشتمالی بننا ناممکن ہو گیا ہے۔

فاشستوں نے محض پیدائش دولت اور مساویانہ تقسیم کی پرستش کو مملکت کی پرستش سے مبدّل کر دیا۔ مملکت کی پرستش بجز بڑے پیمانہ پر قبائلیت کے جو دورِ وحشت کی تہذیب کی یادگار ہے اور کچھ نہیں۔ "غلط یا صحیح جو کچھ بھی ہو میرا وطن ہے۔" فاشیت ایک طاقتور مملکت کی تعمیر چاہتی ہے۔ اور بطور فوق الفرد ہستی کے مملکت کی پرستش کی تلقین کرتی ہے۔ اسلام بھی ایک طاقتور مملکت کی تعمیر کی ضرورت محسوس کرتا ہے جو قوم کے اساسی حقوق کا تحفظ کرے۔ باہر کے حملہ آوروں سے اپنا بچاؤ کرے۔ اور طاقتور کی ظلم و زیادتی سے کمزور کی حفاظت کرے۔ اسلام ایک اجتماعی اور سیاسی مذہب ہے۔ اور اس کے تمام آئین و دستور کا تعلق معاشری عدل اور معاشری اتحاد سے ہے۔ تاہم مملکت یا اس کے قائدین اور حکمرانوں کی غیر مشروط اطاعت واجب نہیں ہے۔ قانون اور نظم و ضبط کی خاطر بالادستوں کی اطاعت کی تعلیم دی گئی ہے۔ لیکن یہ اطاعت ہمیشہ احکام کے اخلاقی ہونے پر مشروط ہے۔

لا طاعۃ للمخلوق معصیۃ الخالق۔ خالق کی نافرمانی کر کے مخلوق کی اطاعت نہ کی جائے۔

اسلام کا اساسی اصول ہے۔ صدر حکومت تک کے اعمال و احکام پر ایک ادنیٰ ترین باشندۂ ملک برسرِ عام نکتہ چینی کر سکتا ہے۔

اسلام کے نزدیک قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔ خود آنحضرتؐ نے لوگوں سے ارشاد فرمایا کہ اگر آپ نے نادانستہ کسی کو نقصان پہنچایا ہے تو وہ اپنے انتقام کا حق خود آپ کے خلاف استعمال کر سکتا ہے۔ فاروقِ اعظمؓ اور حضرت علیؓ بارہا بلا رو رعایت

دادخواہی کے لئے عدالت میں بحیثیت مدعی اور مدعا علیہ کے حاضر ہو چکے ہیں۔

اسلام شوریٰ کے ذریعہ حکومت کی تعلیم دیتا ہے۔ آنحضرتؐ تقریباً ہر روز معاملاتِ حکومت میں اپنے اصحاب سے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ قرآن مسلمانوں کے اوصافِ حسنہ ہی سے بطور خوبی کے اس وصف کا اظہار کرتا ہے کہ وہ مستبد اور آمر نہیں ہوتے بلکہ اجتماعی اہمیت کے تمام معاملات باہمی مشورہ سے طے کرتے ہیں۔

قرآن میں مسلمانوں کو اُمتِ وسطیٰ کا خطاب دیا گیا ہے۔ جو انتہاؤں میں ہمیشہ خیر الامور اوسطہا پر عمل کرتے ہیں۔ یہ یونانیوں کے نظریۂ حیات کے مشابہ ہے جن کا قول تھا کہ زیادتی میں کچھ بھی نہیں۔ خیر الامور اوسطہا کا اصول ارسطاطالیسی اخلاقیات میں محوری نقطہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام کی یہ خصوصیت اس کی تمام تعلیمات اور عمل میں جاری ہے۔ اسلام کی جملہ اخلاقیات عملی اخلاقیات ہے جس نے رینان کو یہ کہنے پر مجبور کیا کہ اسلام بنی نوع انسان کا مذہب ہے۔ یہ فرشتوں کے لئے نہیں ہے۔ ہر حکم میں انسان کی اصلی فطرت کو معہ اس کی تمام جبلتوں اور خواہشات کے ملحوظ رکھا گیا ہے۔ وجدانات اور جذبات زندگی کے لئے بطور آلات کے ہیں۔ یہ نظم و ضبط میں لانے کے لئے ہیں فنا کرنے کے لئے نہیں۔ آنحضرتؐ کے ایک صحابی نے اپنے رنج و افسوس کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا۔ "جب میں آپ کی صحبت میں رہتا ہوں تو میرا اخلاقی رنگ نہایت بلند و برتر رہتا ہے۔ بلند خیالات اور معیارات میرے شعور میں جاری و ساری رہتے ہیں۔ لیکن جب میں آپ سے دور رہتا ہوں، تو میری اخلاقی سطح یکایک پست ہو جاتی ہے۔ میں اپنی حالت پر کس قدر افسوس کرتا ہوں"۔ اس کو سُن کر آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: "تم کو مایوس اور پست ہمت نہ ہونا چاہئے تم انسان ہو فرشتہ نہیں ہو۔ اگر خدا یہ چاہتا کہ دنیا کو ایسی ہستیوں سے آباد کرے، جو اخلاقی کشمکش سے آزاد ہوں، تو وہ ملائکہ کو یہاں بساتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں چاہا۔ تمہاری اخلاقی پشیمانی اور یہ بلندی اور پستی کا احساس ایمان کی علامت ہے"۔ یہ سُن کر آپ کے صحابی کو اطمینان حاصل ہوا۔

انسانی اصلاح و ترقی کے بعض عظیم پروگراموں کا خاکہ مختلف اقوام کے حالیہ مفکرین، قائدین اور مصلحین نے کھینچا ہے۔ ان اصلاحی تجاویز میں سے ہر ایک میں چند ایسے اصول ہیں جو اسلامی غیبیات کے اجزاء ہیں۔ لیکن ان سب میں جُزوی صداقتوں پر دروغ بیانی کی حد تک مبالغہ آمیزی کی گئی ہے۔ دیگر اجزاء کے اخفاء کے ساتھ چند اجزاء پر متشددانہ تاکید نے انہیں بحیثیت مجموعی زندگی کے سلوک میں ناکام و خاسر رکھا ہے۔ حریت پسند عمومیت میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو اسلام کی جزوِ لاینفک ہیں۔ ہر ایک کو مساوی مواقع ملنے، اور قانون کی نظر میں سب کے برابر ہونے کی تعلیم اسلام نے دی ہے۔ لیکن نسلی اور قومی تعصبات حریت پسند عمومیت کے عقائد و اعمال کو اب تک فاسد کر رہے ہیں۔ اسلامی نقطۂ نگاہ سے یہ کافی حریت پسندانہ نہیں ہے۔ نہ اسلام اس سرمایہ دارانہ نظام کی تائید کر سکتا ہے، جس میں سود کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ دنیا کے حاشیۂ خیال میں آنے سے قبل اسلام نے تمام علوم کی آزادی کے ساتھ آزادیٔ تقریر اور آزادیٔ ضمیر کی تعلیم دی تھی۔ دین میں کوئی جبر و اکراہ نہیں ہے۔ یہ قرآن کے اساسی اُصولوں میں سے ایک ہے۔ مغربی عمومیت شہری حقوق میں باشندوں کی مساوات کے اسلامی حکم کو تسلیم کرتی ہے۔ لیکن

باشندوں کی اکثریتوں اور اقلیتوں میں تقسیم کو ضروری اور مخالف جماعتوں کے وجود کو لازمی سمجھتی ہے۔ جن کا خاص مقصد حکومت کے معاملات میں تقریباً ہر چیز کی مخالفت کرنا ہوتا ہے۔ یہ مخالفت صرف مخالفت کی خاطر کی جاتی ہے جس کا معین مقصد بے اعتبار کرنا اور برسر اقتدار جماعت کو بالآخر بے دخل کرنا ہے۔ اشتمالیوں اور فاشسٹوں دونوں نے انتخابی جماعتوں کی سر پھٹول کو ترک کر دیا۔ اور صرف ایک کارفرما جماعت قائم کی۔ جو افراد یا جماعتوں کی طرف سے کسی قسم کی مخالفت برداشت نہ کیا کرے۔ اسلام کا سارا رجحان ان دونو متبادل صورتوں کے خلاف ہے۔ ایک جماعت کی حکومت باشندوں کے آزادانہ احساسات کے اظہار کو سلب کر لیتی ہے۔ ایسی یک جماعتی حکومتوں میں فرد کے لئے کوئی آزادی باقی نہیں رہ سکتی۔ اس کو یا تو جماعت کے احکام کی موافقت کرنی پڑتی ہے یا اپنے ضروری حقوق سے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ اسی طرح حریت پسند عمومیتوں کی جماعتی سیاسیات کے اقتدار کی جد و جہد میں صداقت اور عام خوشحالی برطرف ہو جاتی یا نہایت ثانوی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ ہر پارلیمان میں قوم کے نمائندوں کی گروہ بندی ہوتی ہے۔ ایک آزاد انسان پابند بن جاتا ہے۔ اس طریقہ میں ایک آزاد خیال انسان اگر کبھی وہ منتخب بھی ہو جائے تو نکما سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ کوئی جماعت اس پر اعتماد نہیں کر سکتی۔ سچی اسلامی مجلس شوریٰ میں جیسا کہ حضرت عمرؓ اکثر طلب فرمایا کرتے تھے، اصحاب فہم و کردار بغیر کسی آمرانہ جماعت کو ترتیب دئے یا اکثریت اور اقلیت میں منقسم ہوئے، باہم مجتمع ہوا کرتے تھے۔ اگر کوئی اسلامی مملکت مجالس یا مشاورتی جماعتوں کو مخصوص یا عام مسائل کے حل کرنے کے لئے طلب کرے تو ہر رکن ایک آزاد رکن ہونا چاہئے۔ جو خاص علاقوں یا خاص مفادات کی نمائندگی کرے۔ جو کسی پارٹی کے طریقہ پر منتخب نہ ہوا ہو، اس کا انتخاب صرف اس کے علم و قابلیت کی بناء پر ہوا ہو۔

اسلامی مملکت، فاشستی مملکت کے پیش نامہ کے بعض اجزاء کی، اس کے جملہ تصورات کی تائید کئے بغیر توثیق کرتی ہے۔ فاشیت قوم کو ایک عضوی کل میں ڈھالنا چاہتی ہے جس میں مفاد کی خاطر لڑائیوں کو اتنا کھل کھیلنے کا موقع نہ دیا جائے جس سے قومی یگانگت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ اس میں ذاتی ملکیت کے حق کو اسلام کی طرح تسلیم کیا جاتا ہے لیکن آجر و اجیر کے تمام حقوق مملکت کی پوری نگرانی اور اختیار میں ہوتے ہیں۔ فاشستی پیش نامہ میں بہت کچھ ایسی چیزیں ہیں جو قابل تعریف ہیں لیکن فاشستی مملکت کا اصلی محرک فاسد ہے۔ اس مملکت کا قیام نسلی یا قومی اساس پر ہوا ہے۔ مملکت ایک موضوع پرستش بن گئی ہے۔ جو خود اپنی ایک زندگی افراد کی زندگیوں کے علاوہ رکھتی ہے۔ یہ مابعد الطبیعی اور فسانوی وجود کسی قسم کے اخلاقی مقاصد نہیں رکھتا۔ فرد کی اخلاقیت کا اس پر انطباق نہیں ہوتا۔ مملکت کا مقصد طاقت اور عظمت کو برقرار رکھنا، اور باشندوں کو بے چون و چرا اور سراپا اطاعت کی تعلیم دینا ہوتا ہے۔ بین الاقوامیت سے احتراز کیا جاتا ہے۔ عالم انسانیت ایک بے حقیقت چیز سمجھی جاتی ہے۔ اور اس کے لئے کوششیں منافقت سے موسوم کی جاتی ہیں۔ فاشیت کی رُو سے قومی جماعتوں میں حیاتی تنازع للبقاء ہوتی ہے۔ جو برتر قوت کے ذریعہ بقاء کے سوا اور کوئی قانون تسلیم نہیں کرتی۔ اس کے لئے جنگ کے لئے تیار رہنا ہر مملکت کا اولین فرض ہے۔ اور امن پسندی ذلیل و خوار لوگوں کا مذہب و ایمان ہے۔ جبری ہم آہنگی کے طریقوں کو جاری کر کے قوم کے اندرونی تصادمات کو رفع کرنے کے بعد یہ مختلف مملکتوں کے درمیان

آویزشوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ جیسے یک جماعتی آمریت کی بنا قوت ہے، ایسے ہی فاشستی مملکت کا اساسی تصور تصادم ہے۔ اسلام نسلی یا قومی حد بندیوں کو اہم اور قطعی تسلیم نہیں کرتا۔ اور جملہ بین الاقوامی مساعی امن کی ہمت افزائی کرتا ہے۔ ان تمام مبادیات واصول کی اساس پر جو مختلف مذاہب یا قومی جماعتوں میں باہم مشترک ہیں، ان کے ذریعہ پُرامن تعاون عمل پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ قرآن میں یہودیوں اور عیسائیوں کو ان چیزوں کی طرف جو ان میں باہم مشترک ہیں مسلمانوں کے ساتھ تعاون عمل کی دعوت دی گئی ہے۔ فاشسٹیت نے مجلس اقوام کی اساس کا مضحکہ اڑایا۔ مجلس اقوام اور اس کی جانشین اقوام متحدہ نے نہایت اعلیٰ تصب العین کا اعلان کیا۔ لیکن ان کو روبہ عمل لانے میں بُری طرح ناکام رہیں۔ بجائے امن کے قوت ان کے قلوب پر حکمران تھی۔ اور اس ذہنی صناعت کے ساتھ بین الاقوامی انصاف کے دائرہ میں کوئی حقیقی کامیابی حاصل کرنے کی بہت کم اُمید ہو سکتی تھی۔ اوّلاً یہ کہ ان کے لئے انصاف کے ایک کھلے طریقے پر متفق ہونا ہی دُشوار تھا۔ پھر اگر اتفاق سے وہ راضی بھی ہو جائیں، اور انہیں کوئی ایثار و قربانی کرنی پڑے تو نہ وہ اس کا عزم رکھتی ہیں اور نہ ان کے پاس اپنے فیصلہ کو روبہ عمل لانے کی کوئی قوت ہے۔ مجلس اقوام پر فاشستی اعتراض اگرچہ اس کی عدم صلاحیت پر مبنی نہ تھا، لیکن سرے سے بین الاقوامی انصاف کے تصور ہی کو رد کر دیا گیا تھا۔ فاشستی تصور یہ ہے کہ طاقتور کا یہ حق ہے کہ قبضہ کرے اور تصرف میں رکھے جہاں تک کہ ممکن ہو سکے۔ اور یہ کمزور کی قسمت ہے کہ وہ مغلوب، محکوم اور مطیع بنا رہے۔ اگرچہ اندرون مملکت آویزشوں کو ختم کر دینے اور قومی یگانگت کو حاصل کرنے کے فاشستی طریقوں کی ستائش کی جا سکتی ہے۔ لیکن ایک حقیقی اسلامی مملکت کے لئے اس کا اتباع ایک زبردست اخلاقی زیاں ہے جس کا مقصد تمام نسلی اور قومی حد بندیوں سے ماورا ہو کر عالم گیر امن و امان کا قیام ہے۔

قرآن نے اپنی اس تعلیم سے ایک حقیقی اور مؤثر انجمن اقوام کی اساس کا اعلان کیا ہے کہ اگر دو جماعتیں اپنے کسی اہم حق کے لئے آپس میں لڑ پڑیں تو غیر جانب دار جماعتوں کی طرف سے منصفانہ طریقہ پر اس قضیہ کے تصفیہ کی کوشش کی جانی چاہئے۔ فیصلہ صادر ہونے پر متخاصم جماعتوں پر اس کی پابندی لازمی ہو گی۔ اگر کوئی جماعت سرتابی کرے۔ اور فیصلہ کے مطابق عمل کرنے سے انکار کرے تو تمام جماعتوں کو یا ہم مل کر قوت کے ذریعہ اس کو منوانا چاہئے۔ یہ ظاہر ہے کہ کوئی مجلس اقوام کبھی بااثر نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ اس قرآنی حکم پر عمل پیرا نہ ہو۔

مملکت فلاح وخیر۔ جدید مملکتوں نے تدریجاً ایک مملکت فلاح وخیر کا تصور پیدا کیا ہے۔ مگر ایک تاریخ دان کے لئے اس حقیقت سے انکار دشوار ہو گا کہ مملکت فلاح وخیر کو تشکیل دینے والے اور اس کو روبہ عمل لانے والے پہلے مدبر آنحضرتؐ تھے۔ اس وقت بھی جبکہ انگلستان نے اپنے سیاسی اداروں کو ترقی دی تھی۔ اور پارلیمانی حکومت ایک قابل عمل اساس پر استوار کی تھی اس کا زبردست فلسفی ہربرٹ اسپنسر اصول عدم مداخلت کی حامی مملکت کے تصور کی تائید کر رہا تھا۔ جو محض ایک پولیس مملکت کی طرح کارگذار ہو۔ ایسی انتظامی مملکت اپنے باشندوں سے محصول جمع کرتی ہے۔ تاکہ محصول ادا کنندوں کی طرف سے فوج اور پولیس کو رکھے۔ اور حملہ آوروں اور قانون شکنوں کے خلاف باشندوں کی محافظت کرے۔ مملکت کو باشندوں کے حق

ذاتی نقصان اور چوری و فریب دہی کا بھی انسداد کرنا پڑتا ہے اس کے علاوہ مملکت زیادہ سے زیادہ تعلیم اور صحت عامہ پر خرچ کر سکتی ہے۔ قوم کی معاشی زندگی میں اسپنسر مملکت کی مداخلت کا خواہاں نہ تھا۔ جو صرف آزادانہ معاہدہ پر مبنی ہونی چاہئے۔ قانون طلب و رسد بطور خود توازن پیدا کرے گا۔ آدم اسمتھ نے جو معاشیات میں اصول عدم مداخلت کا باوا آدم ہے۔ حکومت کے اعمال کو صرف تین چیزوں پر محدود کیا ہے۔ اس کا قول ہے "فطری آزادی کے اصول کے بموجب بادشاہ کو صرف تین فرائض انجام دینے پڑتے ہیں۔

اور یہ ہیں حقیقی اہمیت رکھنے والے تین فرائض جو فہم عامہ کے لئے سادہ اور آسان ہیں:

اوّلاً، معاشرہ کو دیگر آزاد معاشروں کے تشدد اور حملہ سے محفوظ رکھنا۔ ثانیاً سوسائٹی کے ہر رکن کی اس کے دیگر ارکان کے ظلم و زیادتی سے تا حدِ امکان حفاظت کرنا۔ یعنی صحیح عدل و انصاف قائم کرنا۔ ثالثاً، چند تعمیرات اور چند ادارہ جات قائم کرنا جن کا قیام و برقراری کسی فرد یا افراد کی قلیل تعداد کے مفاد کے لئے مضر ہو۔

مملکت کے یہ محدود فرائض آجروں اور سرمایہ داروں کو نفع اٹھانے کی بے روک آزادی عطا کرتے ہیں۔ اور دولت کی غلط تقسیم معاشرہ کو دو متحارب گروہوں میں بانٹ دیتی ہے۔ مملکت کی طرف سے کوئی علاج تجویز ہونے سے قبل مالداروں اور نادار وں کے درمیان خلیج وسیع ہو جاتی ہے۔ مزدوروں کی ہڑتال کے خلاف حکومت پولیس کے فرائض انجام دیتی ہے۔ رفتہ رفتہ سیاستدان اور انسانیت دوست مفکرین مملکت کے فرائض میں وسعت دینے کی تحریک شروع کرتے ہیں۔ پہلا علاج معاشری عدم مساوات کو جزوی طور پر ہموار کرنے کے لئے محصول کا ایک اصلاح شدہ نظام تھا۔ سرمایہ دارانہ مملکتوں نے اپنے دائرہ عمل کو وسیع کرنا شروع کیا۔ بے روزگاری کا بیمہ، تندرستی کا بیمہ، وظیفۂ پیرانہ سالی، اور دیگر متعدد ہمدردانہ تدابیر رفتہ رفتہ تجویز کی گئیں۔ اور بعض ممالک نے انہیں ایک حد تک اختیار بھی کیا۔ یہاں تک کہ ہم بیوریج کے منصوبہ (Beveridge Scheme) پر پہنچتے ہیں جس نے ایک مکمل لائحہ عمل، ایک مملکت خیر کے لئے ترتیب دیا ہے۔ یہ رجحانات اس امر کا واضح ثبوت ہیں۔ کہ دنیا کس طرح آزمائش و غیر گذاشت کے طولانی عمل سے گذر کر درجہ بدرجہ آنحضرتؐ کے تصور مملکت کی معقولیت اور صداقت کو دیکھنے کے لئے قریب آ رہی ہے۔

سود کی بابت اسلام کا نقطۂ نگاہ بہت واضح ہے۔ آنحضرت اس پر مصر تھے کہ تمام معاشی معاملات میں سود کا خاتمہ ہو جانا چاہئے۔ اس وقت مغرب کے تمام بڑے معاشیئین کسی قدر جھجکتے ہوئے اسی نظریہ کے قریب آ رہے ہیں کہ بنک کاری کو قومی بنایا جائے اور سود پر قابو حاصل کیا جائے۔ کینس نے مملکتوں کو یہ نصیحت کی ہے کہ وہ اس خصوص میں اخلاقی اور مذہبی تحدیدات عاید کریں۔ لیکن اب بھی معاشیئین یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ سود کو مطلقاً موقوف کر دینا کوئی قابلِ عمل تجویز نہیں ہے۔ اس پر صرف قابو پانا اور پیدائش دولت کے لئے اس کو انتہائی ادنیٰ سطح پر لے آنا چاہئے۔ اسلام سرمایہ کے مالک کو پیداوار مقررہ کے ساتھ حصہ دار بننے کی اجازت دیتا ہے تاکہ سرمایہ پیدائش دولت کے ساتھ ناقابلِ شکست طور پر مربوط رہے۔ اور تجارت کے نشیب و فراز میں دونوں شریک رہیں۔ جب سود پیدا آوری سے محروم ہو جاتا ہے۔ تو مدیون عام خطرات برداشت کرتا ہے۔ حد آنکہ دائن کو حکومت کی طرف سے یہ اطمینان دلایا جاتا ہے کہ وہ بجا طور پر اپنی سودی رقم کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ اسلامی نظام میں اس سرمایہ پر جو بیکار پڑا ہو زکوٰۃ عائد کی گئی ہے۔ اسلام پیدائش دولت اور

تجارت کو فروغ دینے کا خواہاں ہے۔ اور یہ چیز اکتناز کے خلاف اس کے تمام سخت احکام کی تشریح کرتی ہے۔ اندوختہ دولت کا ایک حصّہ حکومت لے لیتی ہے۔ اور اسے اجتماعی فلاح و بہبود خاص کر غریب طبقوں کو مدد دینے میں خرچ کرتی ہے۔ مملکت خیر و فلاح کو انسانی محنت اور قدرتی ذرائع سے نفع اٹھا کر پیدائش دولت کی ہمت افزائی کرنی پڑتی ہے۔ لیکن اس کو اس سے بھی باخبر رہنا پڑتا ہے کہ دولت ساری ہیئتِ اجتماعیہ میں سرایت کئے ہوئے ہے اور کسی حصّہ میں بے جا فراوانی اور کسی دوسرے حصّہ میں بے انتہا کمی کا باعث نہیں بن رہا ہے۔ قرآن آگاہ کرتا ہے:-

کیلا یکون دولة بین الاغنیاء۔ (حشر۔۷) خبردار! دولت صرف مالداروں میں گردش کرتی نہ رہے۔

بے محنت کے کمائی ہوئی دولت زیادہ تر سود اور فاضلات کے اکتناز سے جمع ہوتی رہتی ہے۔ یہ وراثت کے غیر منصفانہ قوانین یا کسی ایک کو تمام جائداد کی وصیّت سے بھی جمع ہوتی ہے۔ حقِ ملکیت اور ذاتی جائداد کے اصول کو عطا کر کے اسلام نے ایک طرف ناواجبی دولت کے اکتناز اور دوسری طرف افلاس کے خلاف ضروری تحفّظات کر دئیے ہیں۔ تمام بڑے مذاہب نے ہمیشہ خیرات پر بہت زور دیا ہے۔ اور بخیل و بے حس مالداروں کو ملعون کیا ہے۔ لیکن یہ اسلام ہی تھا جس نے منصفانہ تقسیم دولت کے مسئلہ کو کامیابی کے ساتھ عملی طریقہ پر حل کرنے کی کوشش کی۔ انسانی فطرت کا اندازہ کر کے اس نے یہ دریافت کر لیا کہ محض اخلاقی پند و موعظت سود مند نہ ہوگی۔ جب تک کہ قوم کا معاشی نظام ضروری قوانین کے ذریعہ از سرِ نو ترتیب نہ دیا جائے۔ مذہبی عقیدہ اور اس کا زبانی اقرار ناکافی ہے۔ قرآن میں نیک لوگوں کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لاتے اور اچھے کام کرتے ہیں۔ اور نیک کاموں میں خیرات پر بحیثیت اصل نیکی کے زور دیا گیا ہے۔ پھر خیرات کی ارادی اور جبری خیرات میں تقسیم کی گئی ہے۔ اپنی خوشی سے خیرات کرنے کی بابت یہ کہا گیا ہے کہ نیکوکار اپنی ضرورت سے زائد کوئی چیز نہیں رکھتے۔ وہ اندوختہ نہیں کرتے بلکہ اپنی زائد دولت کو خرچ کرتے ہیں زکوٰۃ جس کی وصولی کا انتظام حکومت کی طرف سے ہوتا ہے۔ ہر قسم کی مصیبتوں میں امداد کے لئے ہے۔ اسلام کے اہم ارکان میں سے یہ ایک ہے جس کا بیان قرآن میں اکثر نماز کے ساتھ اس تنبیہ سے کیا جاتا ہے کہ ان لوگوں کی عبادتیں جو زکوٰۃ یا خیرات نہیں دیتے خدا کے پاس بے اثر اور ناقابلِ قبول ہیں۔ اپنے گرد و پیش کی معاشی زندگی پر نظر فرما کر آنحضرتؐ نے متعدد موقعوں پر اس امر کی صراحت فرمائی کہ کس مقدار سے اوپر فاضل دولت شمار کی جائے۔ اور کس حد تک اس پر محصول عائد کیا جائے۔ اگر معاشرہ کے معاشی نظام میں بنیادی تبدیلیاں واقع ہوں تو ہمیشہ منصوبہ کے اقتضاء اور مقصد کو پیش نظر رکھ کر اس کی جزئیات میں حالات کی مناسبت سے مطابقت دی جا سکتی ہے۔ اسلام کی رُو سے جمع شدہ فاضل دولت اخلاقی اور معاشی مضرت کا موجب ہوتی ہے۔ اور غریب و مفلوک الحال بے بس لوگوں کے اخلاق بگاڑ دیتی ہے۔ جس سے پورا معاشری نظام فاسد ہو جاتا ہے۔ زکوٰۃ کے معنی پاکی اور نمو افزونی اور بخشش و رحمت کے ہیں۔ جو جماعت اس کی پابندی کرتی ہے وہ پاک ہوتی اور پھلتی پھولتی ہے کیونکہ اصلی خوشحالی تو اجتماعی صحت مندی کے اور کچھ نہیں۔ معاشی زندگی کی کامیابی اور ترقی کا دار و مدار اسی پر ہے۔ یہ مسلمانوں کے بیت المال محسوب ہے۔ آنحضرتؐ کو کفر اور افلاس دونوں سے اندیشہ تھا۔ آپؐ نے غربت و افلاس کے انسداد کو اسلام کے اہم مقاصد

سے بیان فرمایا ہے۔ متعدد دیگر مذاہب نے افلاس کی مدح سرائی کو روحانیت کی حد تک پہنچا دیا ہے۔ یہ اندازِ فکر افلاس اور سادہ زندگی میں خلط مبحث کا نتیجہ ہے۔ سادہ زندگی کی آنحضرتؐ نے توصیف فرمائی، اور اس پر عمل کر کے دکھلایا۔ لیکن افلاس کے متعلق آپؐ نے خدا سے دعا فرمائی کہ اسے انسانوں سے دور رکھے، جیسا کہ آپؐ کا ارشاد ہے:

الفقر سواد الوجہ فی الدارین۔ افلاس دونوں جہان میں موجب روسیاہی ہے۔

جس کے سبب بعض دفعہ ایمان سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ اسی طرح بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ آپؐ دولت کی افزونی سے ہراساں تھے۔ یہ روایت کی گئی ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: "مسلمانو! مجھے تمہارے افلاس سے زیادہ تمہارے قول سے اندیشہ ہے۔" آپ کے بعد جب ایران فتح ہوا۔ اور بیش قیمت مالِ غنیمت کے انبار حضرت عمرؓ کے سامنے لگائے گئے، تو آپ کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ کسی نے دریافت کیا "اے امیر المومنین یہ محل شادمانی اور مسرت کا ہے نہ کہ غم واندوہ کا۔" اس پر خلیفہ نے ارشاد فرمایا "مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں یہ اسلام کے لئے خطرہ نہ ثابت ہو۔ یہ اظہارِ خیال اسلام کے ان مخالف اور جاہل مکہ چینوں کی آنکھیں کھول دیگا جو یہ کہتے ہوئے نہیں شرماتے کہ مالِ غنیمت کی محبت سابقینِ اسلام کی جنگ آزمائیوں کا بھی اصل محرک بنی ہوئی تھی۔

زکوٰۃ کا آئین جو اسلامی مملکت خیر کا ایک محوری نقطہ ہے اس امر کا متقاضی ہے کہ ہم اس کی مزید وضاحت کریں۔ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے "صرف زکوٰۃ کی ادائی ہی میں تمہارے اسلام کو پناہ مل سکتی ہے۔ اپنے مال و دولت میں سے زکوٰۃ ادا کرو۔ یہ تمہیں پاک و صاف بنائے گی۔ اور تمہیں ان کا حق ادا کرنے کے قابل بنائے گی جو تمہارے رشتہ دار ہیں۔ سائل، ہمسایہ اور مسکین کے حقوق سے باخبر رہو اور فضول خرچی میں مبتلا نہ ہو۔" "جو قوم زکوٰۃ کو موقوف کر دیتی ہے، وہ قحط و فلاکت سے ہم آغوش ہوتی ہے۔" "بغیر زکوٰۃ کے اللہ کے نزدیک ایمان قابلِ قبول ہے نہ عبادت۔"

کوئی مملکت اسلامی مملکت کہلانے کی مستحق نہیں، اگر وہ زکوٰۃ کے احکام سے بے اعتنائی برتتی ہے۔ کیونکہ اسلام کی رُو سے مملکت کا مقصد بجز اجتماعی فلاح و بہبود کے اور کچھ نہیں، اور اجتماعی فلاح بغیر زکوٰۃ کے ناممکن ہے۔ اگر انفرادی حق قانون سازی اور ذاتی ملکیت کو انفرادی آزادی میں بطور ایک ضروری عنصر کے شامل کیا جائے۔ لیکن یہ نظام بلا اصلاحی محاصل کے اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے، تو بعض لوگ یقیناً اپنی حاجت سے زیادہ اس کو حاصل اور جمع کر لیں گے۔ اور دوسرے بے نوائی اور افلاس میں چھوڑ دئے جائیں گے۔ اس لئے طریقۂ تحصیل اور تقسیم دولت پر حکومت کا اختیار اور قابو ہونا چاہئے۔ اسلام کی سیاسی کامیابی کے بعد بعض عرب قبائل اسلامی مملکت کے حلقۂ اثر میں بلا اسلام کی روح کو بخوبی سمجھے اور اخذ کئے بسرعت داخل ہونا شروع ہوئے۔ قرآن میں ایسے لوگوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ جب وہ اقرار کرتے ہیں کہ وہ ایمان لے آئے ہیں تو ان سے کہا جائے کہ انہوں نے صرف اسلام کی قوت کے آگے اپنا سر اطاعت جھکا دیا ہے۔ اور ایمان ایک قلبی اثر پذیری کا معاملہ ہے۔ آنحضرتؐ کے وصال کے بعد ایسے متعدد قبائل نے زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کر دیا اور عدم ادائیگی محصول کی مہم شروع کر دی۔ آنحضرتؐ کے جانشین متحیر تھے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ کیا کیا جائے جو خود کو مسلمان کہتے ہوں، خدا کی وحدانیت پر ایمان لاتے ہوں، اور نماز ادا کرتے ہوں۔ اور خلیفہ کس طرح

بل ایمان کے خلاف برسرِ جنگ ہو سکتا ہے؟ ابتداً یہ خیال حضرت عمرؓ جیسے مضبوط ارادہ رکھنے والے لوگوں کا بھی تھا۔ لیکن اس
خصوص میں آنحضرتؐ کے خلیفہ اوّل حضرت ابوبکرؓ اسلام پر ایک صاف اور واضح مدبرانہ نظر رکھتے تھے۔ آپ کا خیال تھا کہ بغیر
زکوٰۃ کے ایمان نامکمل رہتا ہے۔ نمازیں ادا کرنا لیکن بہبودِ عامہ میں حصّہ نہ لینا اور اس کے لئے ایثار اور قربانی نہ کرنا فی الواقع
ایمان کی نفی و انکار ہے۔ آپ نے فرمایا میں ان سے لڑوں گا جنھوں نے اس محصول کی ادائیگی سے انکار کیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے بھی آپ کی
اعلیٰ بصیرت اور اٹل فیصلہ کی داد دی۔ اور واقعتاً ایک خوں ریز جنگ اس مقصد کے تحت لڑی گئی۔ مقام افسوس ہے کہ مابعد زمانوں
میں یہ لازمی محصول جو فلاحی مملکت کا سرمایۂ قوت تھا اور جس کی تحصیل و تقسیم مملکت کے ذریعہ ہونی چاہئے تھی اختیاری بن کر رہ گیا
اور اس کو ادا کرنے والے کے ضمیر و ایمان پر چھوڑ دیا گیا۔ مغرب کی معاشیات عدم مداخلت نے معاشی توازن پیدا کرنے کے لئے افراد
کی روشن خیال خود مطلبی پر اعتماد کیا تھا۔ اور اب اس چیز کو دنیا جانتی ہے کہ ان وجدانات کے غلط مطالعہ نے کیا افراتفری
برپا کر رکھی ہے۔ خود مطلبی ایسی روشن خیال ثابت نہیں ہو سکتی۔ کہ انفرادی اور اجتماعی مفادات کسی من جانب اللہ انتظام سے ایک دوسرے
کے موافق ہو جائیں۔ مسلمان مملکتوں نے جو زکوٰۃ کے معاملہ میں مسلمانوں کے ایمان پر اعتماد کیا تو وہ غلطی کی مرتکب ہوئیں۔ حکومت کے
اختیار و قابو سے نکل کر زائد سرمایہ بیت المال میں جمع نہ ہو سکا۔ اور بہت سے فلاح و بہبود کے منصوبے بھی انفرادی ضمیر و ایمان پر چھوڑ
دیئے گئے۔ اسلام نے پیدائش و تقسیم دولت کے انتظام کی ذمہ داری حکومت پر عائد کی تھی۔ اسلامی حکومت کو ہمہ گیری عفریت بنے بغیر
اس کام کے کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ قانون سازی کا اہم مسئلہ حکومت کی مداخلت اور فرد کی آزادی دونوں کے حدود کے تعین کے لئے
ہے۔ اسلام نے اس مسئلہ کو ایک دلپذیر اور سہل العمل طریقہ پر حل کیا ہے۔ لیکن مسلمان مملکتوں نے خود اس تجویز کو غارت کر دیا۔ زکوٰۃ ایک
محصول ہے جو سرمایہ پر عائد کیا جاتا ہے۔ یہ دولت کو ان حصّوں میں گردش کراتا ہے جو اس کے زیادہ حاجت مند ہوتے ہیں۔ زکوٰۃ دولت
کی ربط دہی اجتماعی فلاح و بہبود کے ساتھ کرتی ہے۔ اور یہ اصول عدم مداخلت کی نقیض ہے۔ مسلمان مفکرین اور مشہور عالمانِ دین نے اخلا
پاکیزگی اور عام خوشحالی کے لئے زکوٰۃ کی اہمیت کو تسلیم کر چکے ہیں۔ یہاں حضرت شاہ ولی اللہؒ کی ایک عبارت پیش کی جاتی ہے جو اسا
کے ایک دلی صفت مفکر تھے۔ فرماتے ہیں: "اس حقیقت کے سمجھنے میں کوئی سوءِ فہم نہ ہونا چاہئے۔ کہ زکوٰۃ کا حکم دو مقصدوں کی تکمیل کے
دیا گیا ہے؛ ایک تادیبِ نفس، اور دوسرے بے نوائی کے خلاف فراہمیٔ اسباب۔ مال و دولت، بخل، خود غرضی، باہمی عناد، نفرت اور ا
تنزل پیدا کرتی ہے۔ ان خرابیوں کا بہترین علاج مال و زر کی فیاضانہ بخشش و عطا ہے۔ اس سے بخل کا استیصال اور خود غرضی کا علاج ہوتا ہے
یہ معاشی زخموں کو پر کرتی اور اس کی جگہ جذبۂ رفاقت پیدا کرتی ہے۔ یہ رفاقت اعلیٰ اخلاقی کردار کا سنگِ بنیاد بن جاتی ہے جب یہ ترقی
پاتی ہے تو ایماندارانہ سلوک کے عادات کی پرورش کرتی ہے۔ رفتہ رفتہ لیکن یقین کے ساتھ یہ شریفانہ اوصاف انسان کو اعلیٰ
برتری کا نمونۂ اخلاق بنا دیتے ہیں۔ اس کے معنی تادیب نفس کے ذریعہ اصلاح ذات کے ہیں۔"
زکوٰۃ قومی اور معاشری افلاس کے خلاف ایک نہایت مؤثر تدبیر ہے۔ کیونکہ ایک شہری بنا اس وقت تک ممکن نہیں
ہو سکتی جب تک کہ وہ کسی درست معاشی اساس پر استوار نہ ہو۔ ایک سوسائٹی اپنے معاشی نظام ہی کے ذریعہ اپنے ممتاز

کی ضرورتوں اور حاجتوں کا ان کی حیثیت کے مطابق انتظام کرسکتی ہے۔ وہ گداگروں کو پھیلنے سے روکتی ہے۔ کیونکہ نادار، معذور، اپاہج، یتیموں اور ایسے ہی محتاجوں کے دیگر تمام قبیل کی مناسب طریقہ پر نگہداشت کی جاتی ہے۔ اور انہیں بھیک مانگنے کی ذلت اور بے عزتی سے بچایا جاتا ہے۔ یہ مملکت ہی کا کام ہے اور اس کو ان لوگوں کی پرورش و پرداخت کا کفیل ہونا چاہئے۔ مگر یہ بوجھل ذمہ داری اسی وقت قابلِ اطمینان طریقہ پر انجام دی جاسکتی ہے جبکہ حکومت کے معمولی ذرائع آمدنی کے ساتھ زکوٰۃ کی صورت میں ایک معتدبہ رقم دولت مندوں سے حاصل ہوتی رہے۔

قرآن نے چند ایسے طبقوں کے نام گنائے ہیں جو زکوٰۃ کی رقم سے امداد و اعانت کے مستحق ہیں:

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۖ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝ (التوبہ - ۶۰)

خیرات غرباء و مساکین کے لئے ہے اور ان کے لئے جو اس کام پر مامور ہوں، اور ان کے لئے جو جدید الایمان ہیں، اور ان کے لئے جو غلامی اور قرض میں ہیں، اور یہ راہِ حق میں خرچ کرنے اور مسافروں کے لئے ہے، یہ خدا کا حکم ہے اور خدا جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

غریب اور محتاج کے دو لفظ اس قدر جامع ہیں کہ ان تمام حالتوں کی ایک فہرست بنانا ناممکن ہو جائے گا۔ جن میں انسان ضروریاتِ زندگی کے لئے اعانت کا خواستگار ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے محتاجوں کی قبیل میں نہ صرف ملازمت کے نااہل لوگوں کو بلکہ بے روزگاروں کو بھی ان میں شامل فرمایا ہے۔ یعنی ایسے لوگ جو کام کرسکتے ہیں لیکن جنھیں کام نہیں ملتا۔ ان میں سے ایک قسم خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے۔ آنحضرتؐ انسانیت کو زبردست آزادی دلانے والے اور اس کے سخت آرزومند تھے کہ غلامی کے رواج کو برخاست کردیا جائے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ کسی غلام کو آزاد کرنا انتہا درجہ قابلِ قدر عمل ہے۔ چونکہ قدیم تہذیبوں کا جملہ معاشی نظام غلامی کے رواج پر قائم تھا اس لئے بیک جنبشِ قلم اس کو ختم کرنا ناممکن تھا۔ چند اعمال کے ارتکاب اور ترکِ فعل کے کفارہ میں بطور تدبیر کے غلاموں کو آزاد کرنے کا حکم دیا گیا۔ غلاموں کے ساتھ رفق و ملاطفت کا سلوک کرنے کے لئے آقاؤں سے پُرجوش اپیلیں کی گئیں لیکن اس اصول کی رُو سے کہ حکومت تمام اہم معاملات کو افراد آزادانہ حق قانون سازی کے ساتھ اپنے ہاتھ میں لے لے۔ مملکت پر یہ چیز بھی لازم کردی ہے، کہ وہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ غلاموں کی آزادی پر صرف کرے۔ حکومت کو اس شخص کی بھی اعانت کرنی چاہئے جو قرض میں گھرا ہوا ہو اور بدقسمتی سے اس حالِ زار میں مبتلا ہوگیا ہو۔ غیر مستحق قرض داری سے رہائی بخشنا بھی حکومت کا ایک فرض ہے فی سبیل اللہ کی اصطلاح رفاہ عامہ کے تمام اعمال پر حاوی ہے۔